برصغیر کی جدوجہد آزادی میں محمد علی جوہرؒ کا حصہ

پروفیسر ڈاکٹر زیبا افتخار
شعبہ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی

Prof. Dr. Zeba Iftikhar

ABSTRACT:

Maulana Muhammad Ali Jauhar (1878 - 1931) is known as a renowned leader of Liberation Movement in Indo-Pak. He bears a multidimensional character however his contributions as a politician is emphasized more as compared to other aspects of his character. Quite a Number of books have been published on his role in Liberation Movement. Infact, he was not only a politician whose dedicated contributions gave Muslims a separate homeland but also a great scholar, a trustworthy journalist, a cynic critic and a valiant speaker.

Karachi Trial, a rather gloomy aspect Maulana's life, although it was much popular, did not receive as much publications. However, only one out-dated and un-available book entitled 'Mo'arkae Siyasat-o-Khilafat' compiled by Mr. Abdur Rahman (probably published in 1921 or 1922) summarizes all the proceedings of this case. This book gave me a lot of information related to Karachi Trial and helped me in writing my article. In this article, I have covered all the legal proceedings of the case as well as the uniqueness of Maulana's role in the case.

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر

ہر، برِصغیر پاک و ہند میں برطانوی حکومت کے خلاف تحریکِ آزادی کے ممتاز اور نامور مسلمان رہنما، ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو بمقام نجیب آباد، ریاست رام پور کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔[1]

محمد علی کے آباؤ اجداد پشاور کے ایک گاؤں "مرغز" سے نقل مقانی کر کے ہندوستان پہنچے اور مراد آباد کے علاقے میں بود و باش اختیار کر لی اس خاندان کے بزرگ سر براہ کا نام "حیات خان" تھا۔[2] جن کی سرکردگی میں یہ خاندان مراد آباد پہنچا۔ اس خاندان میں کئی افراد نامور ہوئے، ناموری حاصل کرنے والوں میں ایک "خان سامان علی بخش" بھی ہیں۔ جو کہ ولی عہدِ سلطنت "یوسف علی خان بہادر" کی ملازمت سے منسلک تھے۔ اور جب یہ ولی عہدِ سلطنت نواب بنے تو خان سامان علی بخش کی وفاداری کے صلہ میں اُن کا تقرر ریاست کے ایک اہم عہدے پر کر دیا گیا۔ انہوں نے ہمیشہ وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کئے۔ غدر کے زمانے میں انھوں نے روہیل کھنڈ اور کماؤں میں بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ اور جب "باغیوں" نے انگریزوں کی ایک جماعت کو نینی تال اور الموڑہ میں گھیر لیا تو ان انگریزوں کو موت کے منہ سے انھوں نے ہی نکالا تھا۔ انگریز حکومت نے اُن کو انہی خدمات کے صلہ میں ضلع مراد آباد میں ایک مستقل جاگیر عطا کی اور اُن کو اپنے آقا کا دستِ راست قرار دیا۔[3]

علی بخش کے بیٹے "عبد العلی خان" بھی ریاست کی فوج میں رہے اور ریاستی سول سروس میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ مگر قضاء نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی اور وہ عالم جوانی میں ۳۳ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔[4]

عبد العلی خان کے تین بیٹے تھے، ذوالفقار علی، شوکت علی اور سب سے چھوٹے محمد علی۔ محمد علی اور اُن کے بڑے بھائی شوکت علی، تاریخ میں علی برادران کے نام سے معروف ہوئے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے دو روشن اور درخشاں ستارے انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن اور

سامراجی طاقتوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔ فرعون کے محل ہی میں موسیٰ پلتے ہیں۔ شب کی ظلمتوں کے بعد ہی سورج نکلتا ہے، مسلمانوں کی حالت سے اللہ کبھی غافل نہ ہوا، وقت نے معجزہ دکھایا اور انگریزوں کے یہی خواہ اور وفادار کے پوتے ہی انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن ثابت ہوئے۔

یہ دونوں بھائی کم سن ہی تھے کہ والد کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ والد کے انتقال کے وقت شوکت علی کی عمر سات سال جبکہ محمد علی صرف دو سال کے تھے۔ ۲۷ سالہ بیوہ ماں نے بڑے حوصلے سے اپنی اولادوں کی تربیت کی، خود تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود، انتہائی روشن خیالی سے کام لیتے ہوئے اپنے بیٹوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کیا۔ ان کا نام عابدی بیگم تھا[۵] جو آگے چل کر "بی اماں" کے محترم نام سے معروف ہوئیں اور آج تک اسی نام سے تاریخ کے سنہرے ناموں میں سرِ فہرست ہیں۔ اسی پرعزم ماں کے زیرِ سایہ پرورش پانے والے بیٹوں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ آج بھی اس دلیری پر تاریخ انگشت بدنداں ہے۔ اُن کا مشن برصغیر کی سرزمین کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا اور خلافت عثمانیہ اور مقاماتِ مقدسہ کا تحفظ تھا۔ اس سلسلے میں اُن کی خدمات کی فہرست طویل ہے اور اُن پر آنے والی صعوبتوں کی فہرست اُس سے بھی زیادہ طویل، مگر ثابت قدمی اس پائے کی تھی کہ کبھی ہلکی سی لغزش بھی نہ آئی۔

دورِ طالب علمی کے بعد کچھ عرصہ تو محمد علی نے اعلیٰ انتظامی و تعلیمی عہدوں پر ملازمت کی، دورانِ ملازمت اُن کے مختلف رسائل[۶] میں شائع ہونے والے مضامین نے نہ صرف اُن کو شہرت عطا کی بلکہ اُن کے اندر خود اعتمادی اس طرح جگائی کہ ملازمت سے استعفیٰ دیا اور یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو ایک ہفت روزہ "کامریڈ" جاری کر دیا۔ یوں اُن کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ جو اُن کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ کیونکہ یہیں سے اُن کی سیاسی زندگی کا بھی آغاز ہوا۔

یہ ایک پُر آشوب دور تھا، برطانوی نوآبادیاتی نظام اپنے عروج پر تھا، اُس کے خلاف کچھ لکھنا یا کہنا آسان نہ تھا، لیکن محمد علی نے اپنے صحافتی اور سیاسی کردار کو انتہائی دلیری، بے باکی

اور ثابت قدمی سے ادا کیا اور کمال جرأت سے حکومتِ وقت کی غلط پالیسیوں کو ہدف تنقید بنایا۔ اُن کی تقریروں اور تحریروں نے جہاں مسلمانوں کے سیاسی شعور کو پوری طرح بیدار کر کے اُن کے اندر آزادی کے لئے جدوجہد کا ایک بے پایاں جذبہ پیدا کیا وہاں اُن کی تنقید سے برطانوی حکومت کے ایوان لرز اُٹھے۔

مولانا محمد علی اسلامیانِ ہند کی ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ وہ مردِ مومن بھی تھے اور بطل حُریت بھی۔ مولانا مودودی اُن کے بارے میں کہتے ہیں۔

> ''محمد علی کا ساز عیم، غلام آباد ہندوستان نے شاید کوئی نہیں پیدا کیا۔ وہ گدائے بےنوا تھا۔ لیکن آغا خان اور مہاراجہ محمود آباد اُس کے حضور جھک کر آتے تھے، وہ اقلیت کا ایک فرد تھا، لیکن اکثریت کا سب سے بڑا لیڈر گاندھی اُس کی جیب میں تھا۔ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا، لیکن دنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اُس سے ڈرتی تھی''۔[7]

مولانا محمد علی جوہر کے تحریر وتقریر کے انداز پر ڈاکٹر ظہر علی صدیقی تبصرہ کرتے ہیں۔

> ''کس بلا کے بولنے والے تھے، بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز احرامِ مصر سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرب کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں۔ یا پھر شاہ کہ ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے ۔میں نے اُن کو اسٹیج پر آتے اور بولتے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انہیں کو داد دی ہے''[8]

گو کہ ہم تک مولانا محمد علی جوہر کی تقریریں، تحریری صورت میں ہی پہنچی ہیں۔ تاہم ڈاکٹر ظہر صاحب کی گواہی پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ کیونکہ تاریخ بھی اُن کی ہم نوا ہے۔ محمد علی جوہر کی عملی زندگی میں تقریروں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ جو سب کی سب اسلام اور آزادی کی حمایت میں تھیں، اپنی شعلہ باز تقریروں کے نتیجے میں اُن کو نظر بندی اور قید و

بند کی صعوبتیں اُٹھانی پڑیں۔ اور مشہور و معروف مقدمہ کراچی بھی ان کی ایسی ہی ایک تقریر کے نتیجے میں قائم ہوا تھا۔ ختم ہوا تو انہی کی شعلہ بیانی پر۔ اور اس مقدمے کو جو شہرت ملی، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس میں مولانا نے اپنا مقدمہ خود لڑا، اور تاریخ نے اپنے اوراق پر اُن کی تقریر کو سنہرے لفظوں میں محفوظ کر لیا۔

> جولائی ۱۹۲۱ء کی ۸، ۹ اور ۱۰ تاریخ کو کراچی میں "آل انڈیا خلافت کانفرنس" کا تاریخ ساز اجلاس ہوا۔ جس کی صدارت مولانا محمد علی جوہر کر رہے تھے۔ کراچی کا عیدگاہ کا میدان اس اجلاس کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ اور اس اجلاس میں ذیل کی قرارداد کو بالاتفاق منظور کیا گیا۔
>
> ''یہ جلسہ اس امر کا صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ بہ حالات موجودہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کے لئے حرام ہے کہ وہ برطانوی فوج کی ملازمت میں رہیں یا دوسروں کو فوج میں داخل ہونے کی ترغیب دیں۔ اور جملہ مسلمانوں کا عموماً اور علما کا خصوصاً یہ فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ یہ مذہبی احکامات فوج کے ہر سپاہی تک پہنچا دیئے جاتے ہیں[9]''

یہ اجلاس "ہندوستانی وفد خلافت" کی ناکامی کے بعد منعقد کیا گیا تھا۔ انگلستان کو جانے والا یہ وفد یکم فروری ۱۹۲۰ء کو مولانا محمد علی جوہر کی سربراہی میں روانہ ہوا تھا۔ جس میں مولانا کے ساتھ سید حسین، سید سلمان ندوی، ابوالقاسم اور حسن محمد حیات بھی تھے[10]۔ اس وفد نے انگلستان، فرانس اور اٹلی کے وزرائے اعظم کے علاوہ پوپ سے بھی ملاقات کی[11]۔ مگر اُن کے مطالبات پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ محمد علی اس وفد کی ناکامی کے بعد مجبور تھے کہ تحریک خلافت کو اتنی زور وشور کے ساتھ چلائیں کہ انگلستان ترکی کے ساتھ انصاف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اس سلسلہ کا یہ واحد جلسہ نہ تھا۔ بلکہ ملک کے طول وعرض میں اس کی حمایت میں بے شمار جلسے ہوئے مگر حکومت کا عتاب جس پر آنا تھا، سو آیا۔

دلچسپ امر یہ تھا کہ ان مجاہدینِ ملک وملت قوم کی گرفتاری کے چرچے پہلے ہی ہونے لگے تھے۔ گرفتاری کا سبب موپلوں کے فساد کو قرار دیا جارہا تھے۔ اس گرفتاری کے متعلق جو اندازہ لوگوں کو ہوا تھا، گو سچا تھا مگر اس کی تعبیر غلط کی گئی تھی، کیونکہ بعد میں جب مقدمہ چلا تو معلوم ہوا کہ گرفتاری موپلاؤں کے متعلق نہیں بلکہ بغاوت کے لئے تھی۔ یہ افواہیں اس شدت کے ساتھ گردش کررہی تھیں کہ ملک کے طول وعرض میں اخبارات اس پر شہہ سرخیاں لگارہے تھے۔ چہ مہ گوئیاں ہورہی تھیں اور عوام مشتعل تھے۔

امرتسر کے اخبار "وکیل" نے صراحت کے ساتھ شائع کیا کہ

"علی برادران کی گرفتاری کی افواہیں گرم ہیں۔ اور اس قدر اصرار کے ساتھ کہ گویا فی الحقیقت اُن کی گرفتاری عمل میں آنے والی ہے...... علی برادران ہندوستان میں تحریکِ خلافت کے روح رواں ہیں۔ غالباً کسی ہندوستانی مسلمان نے تحریک مذکور کی کامیابی اور نشو ونما میں اسقدر سرگرمی، ایثار اور قربانی کا ثبوت نہیں دیا۔ اس لئے گورنمنٹ اس امر سے غافل نہیں ہوسکتی کہ ان کی گرفتاری تحریکِ خلافت پر ایک براہِ راست حملہ تصور کی جائے گی۔ اور اس کے نتائج یقیناً اچھے نہیں ہونگے، لہذا گورنمنٹ کو اس غلطی میں نہیں پڑنا چاہیے[۱۲]"

۹ ستمبر کو "ینگ انڈیا" میں گاندھی جی کا بیان بھی کچھ اسی سے ملتا جلتا تھا۔ انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ......

"علی برادران کو آزاد ہی رکھنا چاہیئے۔ اُن کی گرفتاری سے امن قائم رکھنے کا کام اُس سے بھی زیادہ مشکل ہوجائے گا۔ جتنا کہ اب ہے۔ اور کوئی بھی دو آدمی ایسے نہیں جن کی عدم تشدد کے متعلق وعظ نے مسلمانوں کو ضبط میں رکھنے کے لئے علی برادران کے وعظ سے زیادہ کام کیا ہو"

گاندھی جی نے حکومت پر واضح کیا کہ

"علی برادران پر مقدمہ چلانے کا واضح مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان میں خلافت تحریک کا گلہ گھونٹنے کا ارادہ ہے۔ اور یہ تمام ہندوستان کے لئے کھلا چیلنج ہوگا کیونکہ اب خلافت کا سوال مسلمانوں کا سوال نہیں رہا بلکہ تمام ہندوستانیوں کا مشترکہ سوال ہے[۱۳]"

اتنی واضح تشبیہات کے باوجود حکومت کے ارادوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ علی برادران نے بھی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی گرفتاری کا خدشہ ظاہر کیا۔ بمبئی کے ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہماری ممکنہ گرفتاری کے بعد تمام کارکنان قومی خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہیں۔ چودہ ستمبر کو بنگلور میں ایک جلسہ، اس افواہ کی بناء پر منعقد کیا گیا۔ جس میں ان رہنماؤں کی ممکنہ گرفتاری کی مذمت کی گئی اور حکومت کو اس کے برے نتائج سے صاف الفاظ میں آگاہ کر دیا گیا۔ ان سب کے باوجود حکومت کو جو کرنا تھا وہ اس نے کیا۔ اسی دن جبکہ مولانا محمد علی، گاندھی جی کے ساتھ مالابار خیر سگالی کے دورے پر جا رہے تھے، درمیان میں والٹیئر کا اسٹیشن پڑتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا، جہاں ٹرین صرف آدھے گھنٹے کے لئے رکتی تھی۔ اس مختصر سے وقت میں بھی وہ یہاں ایک تقریر کرنا چاہتے تھے۔ جب گاڑی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ پلیٹ فارم پر فوجی پہرہ لگا ہوا تھا۔ لیڈروں کی گرفتاری کی افواہ پہلے ہی گرم تھی، چنانچہ ایک صاحب نے مذاقاً کہا ــــــ "مولانا اب آپ کی باری ہے" اُن کا کہا سچ ثابت ہوا[۱۴]، ٹرین سے باہر آتے ہیں پولیس کی ایک جمعیت نے اُن کو گھیر لیا۔ وزیگاپٹم کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی طرف سے جاری کردہ شوکاز نوٹس دیئے گئے اور گرفتار کر لیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۴ ستمبر کا ہے۔ اس موقع پر محمد علی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ میں جو گفتگو ہوئی اس کا ذکر انہوں نے اپنے کوکناڈا کے خطبہ صدارت میں یوں درج کیا ہے۔

"جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے والٹیئر اسٹیشن پر گرفتار کیا تو وہ مجھ

ایک چھوٹی سی جگہ لے گیا، جہاں پولیس کے اسلحے جمع تھے اور پھر اس نے کہا۔ میں آپ سے نیک چلنی اور امن قائم رکھنے کی ضمانت طلب کرتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا۔ آپ مجھ سے امن عامہ قائم رکھنے کی ضمانت طلب کرتے ہیں۔ میں فی الحقیقت امن عامہ قائم و برقرار رکھے ہوئے ہوں۔ مگر آپ اُسے درہم برہم کئے دے رہے ہیں[15]"

تین دن حوالات میں رکھا گیا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ صوبہ بمبئی کے پولیس آفیسر کو موقع فراہم کیا جائے کہ وہ کراچی کے وارنٹ پر اُن کو گرفتار کر سکے[16] چنانچہ تین دن کے بعد ان کو کر رہا کر دیا گیا اور باہر آتے ہی کراچی کے وارنٹ پر دوبارہ گرفتار کر لیا اور کراچی پہنچا دیا گیا[17] اور وہ مشہور و معروف مقدمہ چلایا گیا جو برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں "مقدمہ کراچی" کے نام سے معروف ہوا۔ اس مقدمے کے صرف مولانا ہی ملزم نہ تھے بلکہ اُن کے بھائی شوکت علی، حسین احمد مدنی [18]، ڈاکٹر سیف الدین کچلو [19] ، ہری شنکر اچاریہ [20]، پیر غلام مجدد سرہندی [21] اور مولوی نثار احمد کانپوری [22] بھی ملوث کئے گئے تھے۔

۱۴/ ستمبر کو مولانا محمد علی کی گرفتاری عمل میں آئی۔ ۱۵/ ستمبر کو ڈاکٹر کچلو کو گرفتار کیا گیا۔ ڈاکٹر کچلو اپنے ڈاکٹر کے مشورے سے چند دن آرام کرنے کی غرض سے شملہ آئے ہوئے تھے، جمعرات کی شام انھیں یہاں ایک جلسہ میں خطاب کرنا تھا۔ صبح گیارہ بجے کے قریب خفیہ پولیس کے ایک افسر نے ڈاکٹر کچلو کو انکی گرفتاری کی خبر دی، یہ اطلاع موصول ہی ہوئی تھی کہ پولیس نے گھیر لیا اور گرفتار کر کے "کالکا" کی جانب روانہ کر دیئے گئے۔ ان کے وارنٹ گرفتاری کراچی سے جاری کئے گئے تھے [23] اگلے ہی دن یعنی ۱۶/ ستمبر کی رات ۲ بجکر ۱۰ منٹ پر مولانا شوکت گرفتار کئے گئے، شوکت علی اسوقت بمبئی کے مرکزی خلافت کمیٹی کے دفتر میں محو خواب تھے، جب ڈپٹی کمشنر پولیس نے مولانا کے کمرے میں داخل ہو کر کہا" گڈ مارننگ شوکت علی، غالباً آپ کو گذشتہ چند روز سے ہمارا انتظار ہوگا، مولانا مسکرائے اور کہا۔ جی ہمیں یہی اُمید تھی میں آپ کے

ساتھ جانے کو تیار ہوں ۲۴" اور پھر پیر غلام مجدد سرہندی، مولانا حسین احمد، مولانا نثار احمد اور سری شنکر اچاریہ بھی گرفتار کر کے کراچی لائے گئے۔ حیرت انگیز صورتحال یہ تھی کہ ان رہنماؤں کی گرفتاری پر نقص امن کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہندوستانی عوام نے اپنے رہنماؤں کی نصیحتوں پر عمل کیا اور صبر و تحمل کا بے نظیر نظارہ سامنے آیا۔

اس گرفتاری پر مہاتما گاندھی نے ایک بڑا پُر زور بیان دیا۔ انہوں نے کہا کہ "میں آپ تمام حاظرین کے روبرو اور آپ کے ذریعہ تمام ہندوستان کے روبرو اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ مولانا محمد علی اپنے اس وعدے سے سرِ مُو نہیں پھرے جو انھوں نے خدا کے نام پر ہندوستان سے کیا تھا کہ وہ کسی کو تشدّد پر نہیں ابھاریں گے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ خلوت اور جلوت میں، موقع بے موقع مولانا محمد علی نے باشندگان ہند سے کامل عدم تشدّد کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت پر زور دیا ____ لیکن اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ علی برادران بزدل ہیں، اگر کسی شخص کو یہ خیال ہے کہ اس بیان نے اُن کے رویہ اور ان کی زبان کو بدل دیا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ ان دونوں بھائیوں سے زیادہ بہادر اور صادق شخص سے مجھے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ____ ۲۵"

ان گرفتاریوں پر تمام ملک میں شدید ردِّ عمل سامنے آیا اور مرکزی خلافت کمیٹی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ نے تمام ملک کی مجالس خلافت اور کانگریس کمیٹیوں کو، کراچی کے ریزرویشن کو دہرانے کی اجازت دے دی (یعنی وہ ریزرویشن جس پر ان رہنماؤں کی گرفتاری عمل میں آئی تھی) چنانچہ ملک میں جا بجا جلسے منعقد ہوئے اور ہزار ہا لوگوں نے مختلف شہروں میں "فوج اور پولیس کی ملازمت حرام ہے" کی قرارداد کا اعادہ کیا ۲۶ یوں جس آواز کو ایک جماعت نے سنا تھا اور ہندوستان میں بہت کم کان اس آواز سے آشنا ہوئے تھے، حکومت کی

غلط پالیسیوں کے باعث اور قائم کئے جانے والے اس مقدمے کی بدولت ملک کے ہر متنفس کو اس سے آگاہ کر دیا۔ اور لوگ کھلم کھلا مخالفت پر آمادہ ہو گئے ____ لارڈ ریڈنگ بہادر کو اپنے تدبر پر ناز تھا۔ انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ ان برگزیدہ رہنماؤں کی گرفتاری سے خلافت کا اجارہ دب جائے گا۔

انہوں نے اپنے ادعائے انصاف کا ثبوت دینے کے لئے عدالت کے اسٹیج پر ایک دلچسپ کھیل مقدمہ کی صورت میں پیش کیا۔ مجسٹریٹ، گواہ، سرکاری وکیل جلوہ افروز ہوئے اور چند روز میں اپنا اپنا پارٹ (کردار) ادا کر کے واپس چلے گئے۔ لیکن جمہور ہند نے نہ تو اس عدالت کو عدالت سمجھا اور نہ انصاف کو انصاف، نہ ہی ان سزاؤں سے گرفتار رہنماؤں کے پائے استقلال میں لغزش آئی اور نہ اُن کے پیروؤں کو عبرت ہوتی۔ وہ ہنستے کھیلتے جیل گئے اور ان کے بعد ہزاروں اُن کی جگہ کام کر کے جیل جانے کو خوش نصیبی سمجھنے لگے ۲۷۔

مقدمہ کراچی، تعزیرات ہند کی دفعات ۱۲۰ الف، ب ۱۳۱ اور ۵۰۵ کے تحت چلا یا گیا۔ بعد میں ان میں دفعات ۱۰۹ اور ۱۱۷ بھی بڑھا دی گئیں تھیں۔ علی برادران پر ایک اور مقدمہ زیر دفاع ۱۲۴ اور ۱۵۳ بھی قائم کیا گیا تھا۔ دفعہ ۱۳۱ کا مفہوم ایسی مجرمانہ سازش میں شرکت تھا جس کا مقصد برطانوی افواج کے مسلمان افسروں اور سپاہیوں کو فرائض کی عدم ادائیگی پر ورغلانا تھا، جبکہ ۱۰۹، ۱۱۷ اور ۵۰۵ ایسے بیانات کو ناجائز قرار دیتی ہیں جن کی وجہ سے برطانوی افواج کے مسلم افسر اور سپاہی اپنے فرائض منصبی کو نظر انداز کریں اور اس کی بجاآوری سے قاصر رہیں ۲۸۔

اس مقدمے کی سماعت کراچی کے مشہور خالقدینا ہال میں ہوئی ۲۹ یہ کشادہ ہال بندر روڈ پر واقع ہے جس میں تقریباً ۶۰۰ سے ۷۰۰ افراد کی گنجائش ہے ۳۰۔ مگر کارکنان سندھ و کراچی اور خلافت نے عدالت کا بائیکاٹ کر دیا۔ چنانچہ اخبارات کے صرف تین نمائندے پہنچے، علی برادران کے سکریٹریز اور ڈاکٹر محمود مقدمے کی کاروائی دیکھنے گئے۔ مجموعی طور پر ہال میں ۲۰۰

سے زائد تماشائی موجود نہ تھے۔ ان میں زیادہ تر جی حضوری اور مقامی وکلاء کے موالاتی ممبرز تھے۔ باقی گیلریاں تحریکِ مقاطعہ کی وجہ سے خالی رہیں ۳۱۔

اس مقدمہ کے دوران خالقدینا ہال اور اس کے اطراف میں سخت پہرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہال کے بندر روڈ والے حصّے کی جانب حفاظت کی غرض سے خاردار تار لگا دیئے گئے تھے، عقبی حصّے میں گورے متعین تھے، خوف کا یہ عالم تھا کہ پہرے کے ساتھ ساتھ ایک مشین گن بھی نصب کر دی گئی تھی۔ قیدی بند گاڑی میں ٹھیک گیارہ بجے ہال میں لائے جاتے اور مجسٹریٹ گیارہ بج کر پانچ منٹ پر مقدمہ کی کاروائی شروع کر دیتا تھا۔ ملزمان کی گاڑی کے آگے پولیس کے سپاہیوں کی ایک لاری ہوتی تھی، جس میں پولیس کے پچاس جوان ہوتے تھے پیچھے پیچھے گوروں کی دو لاریاں ہوتی تھیں اور یوں ملزمان کو مکمل پہرے میں لے کر جیل سے یہ گاڑیاں خالقدینہ ہال پہنچتی۔ جیسے ہی یہ گاڑیاں سڑک پر آتیں تو دو رویہ مجمع اللہ اکبر اور بندے ماترم کے نعروں سے گونج اُٹھتا۔ نقص امن کے خوف سے جیل سے لے کر خالقدینہ ہال تک دو رویہ پولیس اور سوار پہرے پر متعین ہوتے تھے ۳۲۔

یہ مقدمہ ۲۶/ ستمبر ۱۹۲۱ کو شروع ہوا اور یکم اکتوبر ۱۹۲۱ کو ختم ہو گیا۔ چھ روزہ مختصر سماعت کے دوران اسیروں اور عدالت کے درمیان وہ مایہ ناز قصے، جھڑپیں اور لطائف ہوئے کہ جن کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ہال میں اسیروں کی آمد پر دلچسپ صورتحال دیکھی گئی، تارکانِ موالات نے چونکہ عدالت کا بائیکاٹ کر دیا تھا لہٰذا ہال میں کچھ زیادہ لوگ موجود نہ تھے۔ جب لیڈر ہال میں داخل ہوتے تو یہ تماشائی احتراماً اٹھ کر کھڑے ہوتے اور جب تک اس پر لیڈر بیٹھ نہ گئے، کھڑے رہے، مولانا محمد علی جوہر کمانڈر کی طرح گرفتار شدہ لیڈروں کی فوج کے آگے آگے تھے۔ انکے بازو پر خلافت کا نشان تھا اور دائیں بازو میں کلام اللہ حائل تھا، اُن کے پیچھے شوکت علی ہنستے اور حاضرین کے سلام کا جواب دیتے حاضر ہوئے۔ اُن کے بعد دیگر اسیرانِ مقدمہ باہم ہنستے اور باتیں کرتے داخل ہوتے ۳۳۔

اس مقدمہ میں مجسٹریٹ ایس ایم ٹلاٹی تھے اور وکیل استغاثہ ٹی۔جی ایلفنسٹن تھے، جبکہ فدایانِ وطن کی طرف سے کوئی وکیل نہ تھا۔ ابتداء سے محمد علی نے جو موقف اختیار کیا وہ انکے اپنے الفاظ میں یہ تھا۔

"تارکِ حوالات ہونے کی حیثیت سے میں نے اس عدالت کی کاروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ سوائے اس کے کہ میں سمجھنے کی کوشش کروں کہ میرے خلاف الزام کیا ہے"[۳۴]

دراصل ترک مداخلت کا جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا۔ اس میں عدالتوں کا مقاطعہ اور عدالتوں سے عدم تعاون بھی شامل تھا۔ اس کے دو پہلو تھے، ایک تو یہ کہ عوام اپنا کوئی مقدمہ حکومت کی قائم کردہ عدالت میں نہ لے کر جائیں۔ دوسرے ترکِ موالات کی تحریک میں جو لوگ گرفتار ہوں وہ اپنا دفاع نہ کریں۔ اور نہ اُس س تعاون کریں۔ کیونکہ برٹش اقتدار کی تاریخ میں حقیقی انصاف کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہاں ہمیشہ عدالتوں نے حکومت اور اقتدار کے فیصلوں کی توثیق کی ہے۔ پھر ان حالات میں کہ ترکِ موالات کا سارا پروگرام ہی حکومت کے مفادات کے خلاف تھا، اور حکومت نے اپنی انتظامیہ کو ہر قسم کی ظلم وستم کے لئے تحفظ فراہم کر دیا تھا، انصاف کی توقع عبث تھی[۳۵]۔

مجسٹریٹ نے کاروائی کا آغاز کرتے ہوئے محمد علی سے اُن کا اور اُن کے والد کا نام دریافت کیا۔ مولانا نے جواب میں کہا ____ "وارنٹ میں دونوں نام لکھے ہوئے ہیں" مجسٹریٹ نے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے لئے بڑا زور دیا مگر ناکام رہا۔ عدالت سے عدم تعاون کا یہاں تک اظہار کیا گیا کہ جب گواہوں کے بیان ہو چکے تو عدالت نے گواہ پر سوال کرنے کو کہا۔ جس پر سب نے ہی گواہوں پر جرح کرنے سے انکار کر دیا۔

ابتدائی دو دن کی کاروائی میں گواہوں کے بیانات ہی قلم بند ہوتے رہے۔ ان دو دنوں کے دوران صرف ایک دفعہ مولانا نے عدالت سے سوال کیا کہ "آیا آپ ان سوالات کا جواب

ٹھیک طور پر لکھ رہے ہیں، جو یہ گواہ دے رہے ہیں، چونکہ ان کے بیانات میں تضاد تھا" لیکن گواہوں پر جرح نہ کی۔ مقدمے کی کاروائی کا تیسرا دن تھا کہ عدالت نے مولانا سے کہا کہ وہ کوئی بیان دیں گے۔ جس پر مولانا نے کہا۔

''آپ کے اپنے اصولِ شہادت کے متعلق میں نے کاروائی اور گواہوں پر جرح میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ اور جب سرکاری وکیل، اپنے حسب اطمینان، گواہوں سے کوئی جواب نہ لے سکا اور اُن پر جرح کی۔ تو میں نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ ہم تارکانِ موالات کی حیثیت سے اپنے خلاف کسی عدالتی کاروائی میں جو تھوڑا بہت حصہ لینا اپنے لئے جائز سمجھتے ہیں، وہ صرف یہ ہے کہ واقعات کے متعلق ایک بیان پیش کر دیں۔ وہ بھی اپنی صفائی کے خیال سے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ بعض بے ضرورت گواہوں کو بلانے کی تکلیف نہ اٹھائی جائے۔ جن کو ایک واضح بات ثابت کرنے کے لئے طلب جاتا ہے۔ لیکن ان کوششوں کا نتیجہ ممکن ہے صرف یہ ہو کہ وہ واضح بات غیر واضح ہو جاتی ہے"۳۶

انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اقرار کیا کہ

"میں اپنے بھائی اور دیگر اصحاب کے ساتھ کراچی آیا۔ ٹھیک کہنیا پاٹھ شالا میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے ساتھ بیس آدمی اور تھے۔ اور ہزاروں لوگ وہاں ملنے آئے تھے۔ چونکہ یہ قید خانہ نہ تھا لہٰذا میں کہنیا پاٹھ شالا سے باہر بھی جاتا تھا اور واپس بھی آتا تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ۱/۲ ۱ بجے نہیں آیا تھا، جیسا کہ ایک غریب گواہ نے شاید اس لئے کہا ہے کہ اس کا پہرہ رات کے بارہ بجے شروع ہوتا تھا اور اس کو اپنی کارگزاری کچھ نہ کچھ دکھانی ہی تھی..... ہم جو سازش کرتے تھے، وہ دن کے وقت کھلی ہوا

میں کرتے تھے"۔[۳۷]

مولانا نے عدالت کے روبرو تسلیم کیا کہ گذشتہ اجلاس کراچی کے صدر وہی تھے اور انہوں نے ہی وہ قرارداد تیار کی تھی۔ انہوں نے قرآن وسنت کی روشنی سے یہ بات ثابت کی کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون بہانا حرام ہے۔ اور اس کی سزا جہنم ہے۔ اور کراچی کی قرارداد کا بنیادی تخیل بھی یہی حکم ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں دینوی قانون پر خدائی قانون کی بالادستی کا علان کیا اور بتایا کہ وہ صرف اسی حد تک حکومت کے وفادار ہیں، جب تک کہ حکومت کے قانون کا، خدائی قانون سے ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اپنے توضیعی بیان کے آخر میں انہوں نے کہا۔

"ہم نے بحالات موجودہ مسلمان سپاہیوں کو فوج کی ملازمت ترک کرنے کی دعوت دے کر ایک مذہبی اور قانونی فرض پورا کیا ہے ____"

مولانا کا بیان طویل ہو رہا تھا، مجسٹریٹ نے اُکتا کر کہا

"آپ کا بیان کتنا لمبا ہے؟"

مولانا نے سنجیدگی سے جواب دیا ____ "یہی ۱۴ صفحے اور ہیں"۔ (قہقہہ)

بیان کے دوران سرکاری وکیل اور مجسٹریٹ بار بار مولانا کو ٹوکتے رہے اور یہ تقاضا کرتے رہے کہ بیان مختصر کریں۔ آخر کار مولانا سے درخواست کی گئی اور آپ اپنے بیان کو قلمبند کرلیں اور اس کی ایک نقل عدالت میں داخل کرادیں۔ عدالت نے ایک ٹائپسٹ دینے کا بھی وعدہ کیا جس کو انہوں نے منظور کرلیا۔ مولانا کے بعد، مولانا حسین احمد کی شہادت ہوئی، مولانا حسین احمد نے اُردو میں بیان دینا شروع کیا، عدالت کا مترجم اُن کی ثقیل اُردو کا ترجمہ نہ کرسکا اور وہ قہقہوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر کچلو نے اپنی مادری زبان میں بیان دینے پر زور دیا، لہٰذا اُن کا بیان ملتوی کردیا گیا۔ پھر پیر مجدد کی باری آئی تو وہ سندھی میں شروع ہوگئے، انہوں نے مولانا محمد علی کے بیان کی تائید میں کہا کہ یہ قرارداد مولانا محمد علی نے پیش نہیں کی تھی، بلکہ رسول اللہ ﷺ ۱۳۴۰ سال پیشتر پیش کرگئے تھے۔[۳۸]

اس مقدمے کا چوتھا دن تھا کہ جوڈیشل کمشنر نے خالقدینا ہال کا معائنہ کیا۔ وہ سیشن کی سماعت کے لئے موزوں جگہ کی تلاش میں تھا۔ اس پر مولانا محمد علی نے عدالت کی توجہ اس طرف دلائی۔

"اس واقعہ سے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ مقدمہ ختم ہونے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ اُسے سیشن سپرد کیا جائے گا، حالانکہ مقدمہ ابھی زیرِ سماعت ہے۔ یہ انصاف کے نظم ونسق پر بدنما داغ ہے"

وکیلِ استغاثہ نے صفائی میں کہا کہ یہ صرف ممکنات کے لئے تھا کہ شاید اس کی ضرورت پڑ جائے۔ محمد علی نے برجستہ جواب دیا۔

"اگر یہ صحیح ہے تو پھر جہاز بھی بندرگاہ میں تیار کھڑے رہنے چاہیں کہ شاید ہمیں عبورِ دریا شور کی سزا دی جائے۔ میں یہ بات انگلستان کے لارڈ چیف جسٹس (لارڈ ریڈنگ) کی توجہ میں لانا چاہتا ہوں، جنھوں نے بڑے طمطراق کے ساتھ انصاف کئے جانے کا اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد انصاف کا نظم ونسق ایک ڈھونگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا"[۳۹]

مجسٹریٹ نے صرف اتنا کیا کہ آپ کے اعتراض کو قلم بند کر لیا۔

ایک اور موقع پر محمد علی نے مجسٹریٹ سے مخاطب ہو کر کہا کہ۔

"یہ سب ڈھونگ ہے جو رچایا جا رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ ہم ملکی ہو کر اس گندے کھیل میں حصہ لے رہے ہیں"[۴۰]

مقدمے کے پانچویں روز فردِ جرم عائد کر دی گئی اور مقدمہ سیشن سپرد کر دیا گیا۔ یوں اس مقدمے کی کارروائی یکم اکتوبر کو اختتام کو پہنچی، مقدمے کے اختتام پر مولانا محمد علی نے کہا کہ

"میں اپنی اور اپنے رفقاء کی طرف سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا کبھی بھی یہ ارادہ نہ تھا کہ آپ پر کوئی ذاتی حملہ کریں۔ گو کہ ہمیں اس عدالت سے

بہت سی شکایتیں تھیں۔ بہر کیف اگر آپ کو اپنی ذات کے متعلق کسی بات سے رنج پہنچا ہے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ بحیثیت ایک ہندوستانی اسے اپنے دل میں جگہ نہیں دیں گے"

ڈاکٹر کچلو نے وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ____ "یہی الفاظ آپ کے لئے بھی ہیں"۔ انہوں نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا، جبکہ ایس ایم تلاتی نے جذباتی انداز میں جواب دیا کہ "نہیں ____ میں کسی بات سے ناراض نہیں ہوا، بہر حال آپ کے مہربانی آمیز الفاظ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں"[41]

مقدمے کی کاروائی ۴ بجے شام اختتام کو پہنچی۔

۲۴/اکتوبر ۱۹۲۱ء کو جوڈیشل کمشنر سندھ، کینڈی کے سامنے مقدمہ سیشن کا آغاز ہوا۔ مقام وہی تھا یعنی خالقدینا ہال، انتظامات بھی ابتدائی عدالت کی طرح تھے۔ ہال کے احاطے میں سپاہیوں کا کڑا پہرہ تھا، جج کے لئے ہال میں ایک بلند چبوترے پر ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم بنایا گیا تھا اور جج کے داہنے ہاتھ پر پانچ ممبران جیوری کے لئے لکڑی کے پلیٹ فارم پر پانچ کرسیاں رکھی گئیں تھیں[42]۔

حکومت کی طرف سے مسٹر راس السٹن ایڈوکیٹ جنرل اور مسٹر جی، پی انفنسٹن پیروکار تھے۔ شریعت اسلام کے معاملات میں مشورہ دینے کے لئے آئین اسلامی کے ماہر مولانا عنایت اللہ لکھنوی بھی موجود تھے۔ البتہ کوئی وکیل صفائی مقرر نہ کیا گیا بلکہ یہ مقدمہ محمد علی جوہر نے خود لڑا۔

لیڈران قیدیوں کی بند گاڑی میں لائے گئے۔ جس کے آگے پیچھے فوجیوں کی گاڑیاں تھیں جن میں یورپین اور ہندوستانی فوجی سوار تھے۔ جب یہ لیڈران ہال میں داخل ہوئے تو ہال میں موجود لوگ احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے ____ ساڑھے گیارہ بجے جب جج ہال میں داخل ہوئے تو ملزمان کھڑے نہ ہوئے، سرکاری وکیل آنسٹن نے دوستانہ ماحول میں اسیروں کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا اور مولانا محمد علی سے کہا ____ آخر آپ جج کی آمد پر کھڑے کیوں نہیں ہو

تے، مجھے دیکھیئے میں تو خود بخود کھڑا ہو جاتا ہوں، محمد علی نے مسکرا کر کہا ____ "آپ کو تو کھڑے ہونے کی فیس ملتی ہے"[۴۳] جج کی واپسی پر اور دوسرے دن بھی یہی صورتحال رہی تو عدالت نے وکیل استغاثہ سے کہلوایا کہ اگر معمولی اخلاق کا مظاہرہ بھی نہ کیا گیا تو ملزمان کو کرسیوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ جس پر ملزمان نے از خود کرسیاں خالی کر دیں اور فرش پر بیٹھ گئے۔ جج کے اعتراض پر بھی ملزمان وہاں سے نہ اُٹھے وہاں موجود پولیس آفیسر کو کہا گیا کہ وہ ملزمان کو کھڑا کر دیں۔ پولیس افسر نے جب اُن لوگوں کو اٹھانا چاہا تو مولانا محمد علی نے پوچھا ____ "کس قانون کے تحت"[۴۴] ملزمان کو دھمکی دی گئی کہ اُن پر توہینِ عدالت کا مقدمہ چلایا جائے گا۔ مگر وہ اس پر بھی ذرا نہ گھبرائے اور نہ ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔

باقاعدہ کاروائی شروع ہونے سے قبل انفسٹن نے فردِ جرم کی کاپی طلب کی، وہ اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا

> "میں چاہتا ہوں کہ دفعہ ۱۲۰ کے بعد دفعہ ۱۱۵ بھی لکھی جائے۔ کیونکہ انہوں نے اعانت مجرمانہ کی ہے۔ اس لئے جرم کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جائے۔ ۱۔ تنہا مجرمانہ کاروائی کرنا ۲۔ سپاہیوں کو ادائے فرض سے باز رکھنے کی سازش کرنا، وہ سازش کرنے کی حد سے آگے نکل گئے ہیں۔ اور انہوں نے فی الحقیقت سپاہیوں کو ورغلانے کی کوشش کی ہے"

مولانا محمد علی جوہر نے کہا:

''فردِ جرم میں پہلے ہی حسبِ منشا ترمیم ہو چکی ہے''

ڈاکٹر کچلو نے اعتراض کیا:

''جرم میں جو ترمیم کی گئی ہے، وہ قانون کے خلاف ہے،''

اس نے مقدمے کی صورت بدل دی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہ اس تماشے کا دوسرا حصّہ

ہے"۴۵؎

مقدمے کی کاروائی کے دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی صورتحال رہی کہ جب لیڈر ہال میں داخل ہوتے تو حاضرین اُٹھ کھڑے ہوتے۔ مگر جج کی آمد پر لیڈر کھڑے نہ ہوتے اور نہ ہی کرسیوں پر بیٹھتے۔ کرسیوں پر بیٹھے حاضرین کی ایک بڑی تعداد بھی اپنے لیڈروں کے احترام میں فرش پر ہی بیٹھ گئی تھی۔ ان دنوں میں گواہوں کے بیانات ہی لئے جاتے رہے۔ مولانا محمد علی عدالت میں ایک بیان دینا چاہتے تھے، مگر اس کی انھیں اجازت نہ دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باقی ملزمان نے بھی بیان دینے یا صفائی پیش کرنے سے انکار کر دیا۔

سرکاری وکیل نے اپنی تقریر مقدمے کے چوتھے دن کی۔ اس موقع پر مولانا محمد علی نے وکیل کو دو تین موقع پر ٹوکا اور اُن کی تصحیح کی، سرکاری وکیل نے اپنی تقریر ساڑھے تین بجے ختم کی۔ اس کے بعد مولانا کو موقع دیا گیا کہ وہ جیوری سے خطاب کریں۔ خطاب سے قبل انہوں نے عدالت سے درخواست کی کہ

"ممبران جیوری کو اس طرح بٹھایا جائے کہ اُن کے چہرے دیکھ سکوں۔

فوجیوں کی طرح میں ان کو بھی ورغلانہ چاہتا ہوں"۴۶؎

آخر کار عدالت نے ممبران جیوری کو جگہ تبدیل کرنے کی اجازت دی اور خود بھی اپنی نشست کی پوزیشن کو بدل لیا۔ مگر ملزمان اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اس تاریخی خطاب سے چند اقتباسات پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

فردِ جرم کی دفعات پر فرداً فرداً بحث کرنے سے قبل آپ نے خدائی قانون کی بالادستی کو قرآن، انجیل اور شاستروں سے ثابت کیا، انہوں نے نہایت فصاحت اور بیباکی سے، دنیاوی نتائج کی پروانہ کرتے ہوئے، خدا کا اٹل قانون عدالت کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ ایک مسلمان پر حرام ہے کہ کسی دوسرے مسلمان کی جان لے، اور کراچی کی قرارداد کا بنیادی تخیل یہی قرآنی سچائی ہے۔ نہایت خاموش فضا میں کھڑے ہو کر محمد علی نے کہا۔

"میں نہیں سمجھ سکا کہ پہلا الزام کیا ہے اور دوسرا الزام کیا ہے۔ جو جج اور اسیر کی حیثیت سے آپ کے سامنے آنے والا ہے۔ ہاں! والٹیئر اسٹیشن سے مجھے یہاں لانے والے پولیس آفیسر نے مجھ سے پوچھا کہ آپ پر الزام کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں مگر مجھ پر دفعات ۱۲۰، ۱۳۱، ۱۰۹، ۱۱۷ اور ۵۰۵ لگائی گئی ہیں! جس پر پولیس آفیسر نے دلچسپ انداز میں کہا۔ وہ جتنی چاہیں دفعات لگا دیں، وہ سب خانہ ساز ہیں ____"۴۷

محمد علی نے بات جاری رکھی اور جیوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"مجھے معلوم نہیں ہے کہ آپ میں سے کسی نے بلیئرڈ کھیلا ہے؟ اچھا تو اس میں تین گیندیں ہوتی ہیں اور نمبر حاصل کرنے کے لئے آپ کو اپنی گیند پر اس طرح ضرب لگانی چاہیے کہ وہ باقی دو سے جا ٹکرائے اور پھر میز کی کسی پاکٹ میں چلی جائے۔ لیکن بعض اوقات یہ ملعون گیندیں میز پر اس طرح پڑی رہ جاتی ہیں کہ آپ کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ نمبر حاصل کرنے کے لئے اِن کے ساتھ کیا کیا جائے۔ ایسے میں آپ زور سے ضرب لگائیں اور فیصلہ قسمت پر چھوڑ دیں، اکثر اوقات آدمی اس میں نمبر حاصل کر لیتا ہے۔ اسے فلوک (Fluke) کہا جاتا ہے۔ حضرات بالکل یہی حال استغاثہ کا ہے۔ اس نے زور سے ضرب لگائی ہے اور نمبر حاصل کرنے کے لئے آپ پر اور جج پر اعتماد کیا ہے۔ اتنی بہت سے دفعات میں سے کوئی نہ کوئی تو بالضرور چپک ہی جائے گی ____"۴۸

ممبران جیوری کی طرف دیکھتے ہوئے مولانا نے دلچسپ انداز میں کہا

"اک عرب مقولہ ہے۔ کہ خاوند صرف اپنی بیوی سے مشورہ لیتا ہے۔ لیکن

بات اپنی مرضی کی کرتا ہے۔ یہاں جج کی پانچ بیویاں ہیں اور وہ آپ سے صرف مشورہ کرے گا، لیکن کرے گا وہی جو اس کی مرضی ہوگی"[۴۹]

عدالت نے مولانا کی توجہ ان کے کیس کی طرف دلائی، کہ آپ پر الزام ہے کہ آپ اس سازش کے ایک رکن ہیں جس نے سپاہیوں کو ورغلانے کی کوشش کی تھی۔

مولانا نے کہا

''درست، ہم پر الزام لگایا گیا ہے کہ ہم ایک سازش کے رکن ہیں جس کے مطابق ہم میں سے کسی نے سپاہیوں کو ورغلانے کی کوشش کی ہے۔ اور فرض کیجئے ____ مسٹر رالس آلسٹن الہ آباد میں رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک ہی قسم کے لفافے لے کر مختلف جگہوں سے بلکہ زیادہ تر الہ آباد سے جہاں سے مسٹر آلسٹن آتے ہیں (قہقہہ) کچھ اشتہارات باہر بھیج دے تو اس کے عوض مجھے پھانسی پر لٹکایا جائے گا ____؟ کیا اس سے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مسٹر آلسٹن نے بھیجے ہیں ____؟ ____ کیا آپ مجھے اسلئے کالے پانی بھیج دی گے کہ میرے دوست سرکاری وکیل نے اس قدر کڑک اور گرج دکھائی ہے، شہادت میں ذرا بھی ثابت نہیں ہوتا کہ کس نے یہ اشتہار لکھا، جرم ثابت کرنے کے لئے یہ کافی نہیں کہ بعض سپاہیوں کے پاس یہ اشتہار پہنچا"[۵۰]

ایک اور موقع پر محمد علی نے اپنے خطاب کے دوران رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور واقعہ کو بیان کرنا چاہا تو عدالت نے سختی سے ٹوک دیا اور کہا ____ " آپ کو اپنے پیغمبر کا خیال نہیں کرنا چاہیے" مولانا محمد علی نے سختی سے کہا ____ بے شک میں اُن کے ارشادات کا خیال رکھونگا، آپ کو اپنے الفاظ واپس لینے چاہیں۔

مولانا شوکت علی نے کہا ____ یہ ایک گستاخی اور کفر کا حکم ہے۔

مولانا محمد علی نے کہا ــــــ آپ کو یہ ریمارکس واپس لینے چاہیں، آپ کو اس کی تلافی کرنے چاہیے۔ مجھے رسول اللہ ﷺ کی بات کا خیال کرنا پڑتا ہے۔

عدالت نے پھر تنبیہ کہ ــــــ آپ کو اپنی تقریر بند کر دینی چاہیے۔ اس نہج پر آپ اسے جاری نہیں رکھ سکتے۔

مولانا نے کہا ــــــ "میں وہ بات کر رہا ہوں جس کی اجازت مجھے قانون نے دے رکھی ہے۔ قانون کہتا ہے کہ مجھے افواج کو اُن کے فرض منصبی سے ورغلانا نہیں چاہیے، میں یہ کہتا ہوں کہ ایک مسلم سپاہی کا فرض منصبی نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلم بھائی کو قتل کرے۔ اور میں یہاں اس پر تا قیامت بحث کرنے کا حق دار ہوں ــــــ یہ حق لے لیجئے اور اس تماشے کو ختم کر دیجئے۔ نشانہ بازوں کی ایک پارٹی باہر لے چلیئے اور ہمیں یک قلم گولی مار دیجئے یا اگر اس تماشہ جاری رکھنا چاہتے ہیں تو ہماری موت کے بعد ہم پر مقدمہ چلایئے ــــــ "۵۱

مولانا محمد علی اور عدالت کے درمیان اس موضوع پر خاصی دیر تک گرما گرمی رہی، مولا کا اصرار تھا کہ وہ اپنے بیان کو قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور جج اس کو غیر متعلق گردان رہے تھے۔ جج کا موقف تھا کہ مولانا محمد علی صرف اپنے پر لگائے گئے الزام پر بات کریں۔ رسول اللہ ﷺ اور قرآن کے حوالے دے کر وقت ضائع نہ کریں۔ اس نے مولانا کو ہدایت کی کہ ــــــ "آپ صرف اپنے مقدمے کی نسبت بات کریں"

مولانا محمد علی نے کہا ــــــ "اور میں آپ کے مقدمے کی نسبت تو بحث نہیں کر رہا"

جج نے جھنجھلا کر کہا ــــــ "میں آپ کی بات نہیں سننا چاہتا"

مولانا نے لاپرواہی سے کہا ــــــ "تو آپ نہ سنیں، آپ شہادت کے وقت بھی سو رہے تھے۔ اب بھی سو سکتے ہیں۔ میں ممبرانِ جیوری سے خطاب کروں گا۔ ۵۲

آخر کار مولانا محمد علی اپنی بات منوانے میں کامیاب رہے اور بقیہ خطاب میں انہوں نے قرآن وسنت کے حوالوں سے ثابت کیا کہ کراچی کی قرارداد کو کسی بھی پہلو سے جرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انہوں نے کہا ____ "حکومت کے لئے ضروری تھا کہ ایک مسلمان سپاہی سے یہ سوال کرتی۔ کیا تم گناہ کرنے آمادہ ہو ____؟ اگر تمہارا جواب اثبات میں ہے تو آؤ ہم تمہیں آنکھوں پر بٹھائیں۔

جب اس نے یہ سوال نہیں کیا تو اس کے معنی ہیں کہ حکومت بھی سمجھتی ہے کہ شرع اور اسلام کی خلاف ورزی ایک مسلمان کا شعار نہیں ____" ۵۳

انہوں نے براہِ راست ممبران جیوری کو مخاطب کیا اور انھیں انہی کے مذاہب کی روشنی میں، اُن کے دینی فرائض یاد دلائے۔ آخرت میں جوابدہی کا احساس جگایا اور کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میں سے چند حضرات روزِ جزا پر یقین نہ رکھتے ہوں۔ بلکہ تناسخ کے قائل ہوں۔ لیکن روح سے حساب تو ہر مذہب میں لیا جائے گا۔

بحث ختم کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں کہتا ہوں کہ میں کنگ جارج کے قانون کی اس وقت تک پیروی کرونگا۔ جب تک وہ میرے خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر مجھے مجبور نہیں کرتا۔ میرے دل میں بادشاہ کے خلاف کوئی جذبہ عناد نہیں۔ اس عدالت، جج یا حکومتِ وقت کے خلاف کوئی جذبہ عناد نہیں۔ آپ میری پبلک تقریروں سے اس کی ایک بھی مثال پیش نہیں کرسکتے" ۵۴

اس کے بعد انہوں نے حضرت علی اور یہودی کا وہ مشہور قصہ سنایا جو حضرت علی کی تلوار کی زد پر تھا کہ یہودی نے ان کے منہ پر تھوک دیا۔ اور حضرت علیؓ صرف اس لئے اس کو قتل کرنے سے رک گئے کہ اب اس میں خدا کی رضا کے ساتھ ساتھ ذاتی عناد بھی شامل ہوگیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے کہا ____

"اے حضرات جیوری! ہمارے ناموں کے ساتھ بھی حضرت علیؓ کا نام شامل ہے۔ بلکہ میرے نام میں تو ایک ایسی ہستی کا نام بھی شامل ہے جو حضرت علیؓ سے کہیں۔ ارفع ہے۔ میں ذاتی عناد کی بناء پر کسی دیو کو بھی قتل نہیں کرونگا ____ لیکن خدا کی خاطر میں سب کو قتل کر دونگا۔ کسی کو نہیں چھوڑونگا میں اپنے بھائی کو، اپنی پیاری ماں کو، بیوی کو، بچوں کو سب کو اللہ کی خاطر قتل کر دونگا۔ خدا میری مدد فرمائے ____ "۵۵

آپ کے آخری الفاظ آنسوؤں سے بھیگے ہوتے تھے۔ اسی تاریخی خطاب کا نتیجہ تھا کہ ممبران جیوری اپنے ریمارکس میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ ____ "ہم نے ملزمین کے گہرے مذہبی جذبات کا لحاظ نہیں کیا ہے ____" یہ جیوری ایک یورپین، دو عیسائیوں اور دو ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ مولانا محمد علی جوہر واقعی جیوری کو ورغلانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر کے خطاب کے بعد مولانا حسین احمد کا تحریری بیان عدالت میں پڑھا گیا۔ ڈاکٹر کچلو نے عدالت کو بیان دیا بلکہ ممبران جیوری کے سامنے سماعت مقدمہ اور تحریری شہادت کی اہمیت کو واضح کیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک بیرسٹر تھے لہٰذا اس مقدمے کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ترک موالات کی وجہ سے دعدالت سے مقاطعہ کر لیا تھا۔ ڈاکٹر کچلو کے بیان پر اس دن کی کاروائی اختتام پر پہنچی۔

چھٹے دن پیر غلام مجدد کا بیان، مولانا نثار احمد صاحب کا بیان، سری شنکر اور مولانا شوکت علی کا مفصل بیان ہوا۔ مولانا شوکت نے بھی تقریباً چھ بجے شام اپنا خطاب ختم کیا۔ مقدمہ میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ لیکن آرڈر پورے طور پر قائم تھا۔

جب عدالت نے اپنے دلائل کا خلاصہ دیا تو اس نکتہ پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا تھا کہ اس مقدمے کا فیصلہ ملکی قانون کے مطابق ہونا چاہیے، مذہبی عقیدہ خارج از بحث ہے، اور ارکان جیوری کو ایسے تمام خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دینا چاہیے۔

مقدمہ کا فیصلہ ۱۱ نومبر کو سنایا گیا۔ تقریباً سوا دو گھنٹے کے تعطل کے بعد ساڑھے تین بجے ارکانِ جیوری عدالت میں واپس آئے، سازش کے اوّل الذکر دونوں الزامات یعنی تعزیراتِ ہند کی دفعات ۱۲۰ الف اور ۱۳۱ کے تحت انہوں نے کُل ملزمان کو بری قرار دیا۔ یعنی حضور ملک معظم کی افواج کو ورغلانے کی کوشش کرنے کے جرم سے کُل ملزمان بری قرار پائے۔ ان پر یہی سب سے بڑا الزام تھا جس کی سزا عمر قید ہو سکتی تھی۔ البتہ تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۵۰۵ کے تحت جس میں ذکر کیا گیا تھا کہ ایک ایسی تقریر کی گئی تھی جو حضور ملک معظم کی سپاہ کو ان کے فرائض منصبی کی ادائیگی سے قاصر رکھنے والی تھی، سزا سنا دی گئی۔ جیوری کے چار ممبران کی موافقت اور ایک ممبر کی مخالفت سے یہ طے ہوا کہ سوائے سری شنکر اچاریہ کے کُل ملزمان مجرم ہیں۔ سری شنکر اچاریہ کو محض اس شبہ پر رہا کر دیا گیا تھا کہ وہ اُردو نہیں جانتے، حالانکہ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ قرارداد کے ساتھ پورا پورا اتفاق رکھتے ہیں ۵۶۔

جج نے جیوری کے ارکان کی رائے سے اتفاق کیا اور بہ استثنائے سری شنکر اچاریہ کے کُل ملزمان کو دو دو سال قید سخت کی سزا دی۔ دفعہ ۱۱۱ کے تحت مولانا محمد علی جوہر کے متعلق جو الزام تھا، اس پر بھی انہیں دو سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی تھا کہ "پہلی سزا کے ساتھ ہی ساتھ اس سزا کی میعاد بھی چلے گی" ۵۷۔

تمام ممبران جیوری میں سے صرف ایک ممبر ہی ایسے تھے جنہوں نے کسی بھی ملزم کو کسی بھی الزام کے تحت مجرم نہیں پایا۔

حکم سزا سنائے جانے پر کمرہ عدالت "اللہ اکبر" کے پُر جوش نعروں سے گونج اُٹھا۔

مولانا محمد علی جوہر نے اس موقع پر جج کو مخاطب کر کے کہا کہ دو سال گزرنے سے قبل ہی سوراج مل جائے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مذہبی معاملات کے متعلق جج کا نقطہ نظر غلط اور عدالتی انصاف سے بعید ہے ۵۸۔

فیصلہ پر گاندھی جی نے رائے دیتے ہوئے کہا

''ہندوستان میں زمانہ موجودہ میں جتنے مقدمات ہوئے ہیں، ان سب میں عدم تعاون کرنے والوں کا مقدمہ بلا شبہ نہایت اہمیت رکھتا ہے ـــــ میری نظر میں یہ مقدمہ موجودہ نظامِ حکومت کے اختتام کا آغاز ہے"۵۹۔

تاریخ نے بہت جلد گاندھی جی کی اس رائے پر مہر صداقت ثبت کر دی۔

پہلے مولانا محمد علی جوہر کو کراچی میں رکھا گیا، پھر بیجاپور کی جیل میں منتقل کر دیا گیا، یہاں خلافِ قاعدہ ان کو ڈیڑھ سال قید تنہائی میں رکھا گیا، ۱۹۲۳ء میں یہیں سے ان کی رہائی عمل میں آئی، بیجاپور جیل سے چھپ چھپاتے جھانسی کے ریلوے اسٹیشن لائے گئے اور چھوڑ دیئے گئے۶۰۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۹ ص ۴۹۲، مادہ "محمد علی جوہر" مقالہ نویس شیر محمد گریوال دانشگاہ پنجاب، طبع اوّل ۱۹۸۶ء

۲۔ ضیاء الدین احمد برنی۔ 'حیات مولانا محمد علی جوہر' ص ۱۷ کراچی مارچ ۲۰۰۱ء

۳۔ ایضاً ص ۱۸

۴۔ عبد العلی خان کی تاریخ پیدائش ۱۸۴۷ اور تاریخ وفات ۱۸۸۰ء ہے (بحوالہ حیات مولانا محمد علی جوہر، ص ۱۸)

۵۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں مولانا محمد علی جوہر کی والدہ کا نام عابدی بیگم درج ہے۔ جبکہ دیگر تصانیف میں اُن کا نام "آبادی بانو" کہا جاتا ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۴۹۲

۶۔ کامریڈ اور ہمدرد کے اجراء سے قبل مولانا محمد علی کے مضامین
Times of India, Indian Spectator, Lahore Observer, Punjab Review
جیسے مجلّات میں شائع ہوتے تھے۔

۷۔ دائرہ معارف اسلامیہ ج۱۹، ص ۴۹۶

۸۔ ڈاکٹر ظہر علی صدیقی، 'مولانا محمد علی جوہر اور جنگ آزادی' ص ۹ (لاہور ۱۹۹۹)

۹۔ حیات مولانا محمد علی جوہر، ص ۱۹۹

۱۰۔ 'تحریکات علی' (مرتبین، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر انصار زاہد، پروفیسر فصیح الدین صدیقی، مجلہ 'علم وآگہی' گورنمنٹ نیشنل کالج ۳۔۱۹۸۲، کراچی ص ۳۱۶

۱۱۔ دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۹، ص ۴۹۴

۱۲۔ روزنامہ 'وکیل' اشاعت ۱۸ ستمبر ۱۹۲۲، (بحوالہ عبدالرحمٰن "معرکہ سیاست و خلافت" ص ۱۷، ۱۸، امرتسر ت ن

۱۳۔ عبدالرحمٰن، "معرکہ سیاست وخلافت" (امرتسر، ت ن) ص ۱۸، ۱۹

۱۴۔ ایضاً ص ۲۲

۱۵۔ حیات مولانا محمد علی جوہر ص ۲۰۰

۱۶۔ اس زمانے میں سندھ، صوبہ بمبئی سے ملحق تھا

۱۷۔ حیات مولانا محمد علی جوہر ص ۲۰۱

۱۸۔ حسین احمد مدنی، مولانا کے دستِ راست، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم کے جانشین اور اپنے علم وفضل کے لحاظ سے اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔

۱۹۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ایک قابل اور ہونہار بیرسٹر تھے، چند سال پہلے وہ اپنی وضع قطع سے کسی اعلیٰ درجہ کے یورپین سے کم نظر نہ آتے تھے۔ مگر جب ملکی و مذہبی مصائب نے اُن کی حالت بدلی تو ایک سچے باحمیت مسلمان ثابت ہوئے۔

۲۰۔ سری شنکر اچاریہ، ہندوؤں کے روحانی پیشوا تھے بہت سے راجہ مہاراجہ اُن کے عقیدت مند تھے۔ خلافت کے حق وحمایت میں اُن کی خدمات بے مثل ہیں۔

۲۱۔ پیر غلام مجدد سرہندی، سندھ کے مذہبی پیشوا تھے اور کثیر تعداد میں مرید اُن پر کامل یقین رکھتے تھے۔

۲۲۔ مولوی نثار احمد بنیادی طور پر ایک علمی شخصیت تھے، علم و فضل کے لحاظ سے مذہب و ملت کے لئے مایہ ناز تھے اور تحریک خلافت کے روح رواں۔

۲۳۔ معرکہ خلافت و سیاست، ص ۲۱

۲۴۔ ایضاً ص ۲۴۔۲۵

۲۵۔ ایضاً ص ۲۶۔۲۷

۲۶۔ ایضاً ص ۳۲

۲۷۔ حیات مولانا محمد علی جوہر، ص ۲۰۰

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ کراچی کا خالقدینا ہال، سندھ کی ایک مخیر شخصیت "غلام حسین خالقدینا" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ایک کشادہ ہال ہے، تقریباً ۷۰ فٹ لمبا اور ۴۵ فٹ چوڑا، اس کی چھت ۳۰ فٹ اونچی کنگ پوسٹ پر بنائی گئی ہے۔ تین اطراف میں ۱۰ فٹ چوڑا برآمدہ اور سامنے کی طرف ۵۲ فٹ لمبا اور ۳۲ فٹ چوڑا سائبان ہے۔ کراچی کی پہلی لائبریری جو ۱۸۵۱ء میں جنرل لائبریری کے نام سے قائم کی گئی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں اسی ہال میں منتقل کردی گئی۔ ایک عرصے تک یہ ہال سماجی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا۔ بعد ازاں مقدمہ کراچی سے ملنے والی شہرت نے اسکو لازوال بنادیا اور اس کی سیاسی اہمیت بہت بڑھ گئی۔

۳۰۔ احمد حسین صدیقی، " گوہر بحیرہ عرب" ص ۱۳۰ (کراچی ۱۹۹۵)

۳۱۔ معرکہ خلافت و سیاست، ص ۳۲

۳۲۔ حیات مولانا محمد علی جوہر، ص ۲۰۱

۳۳۔ معرکہ خلافت و سیاست، ص ۴۲

۳۴۔ ایضاً ص ۴۲

۳۵۔ تحریکات علی، ص ۳۱۶

۳۶۔ معرکہ خلافت و سیاست، ص ۴۲۔۴۳

۳۷۔ ایضاً
۳۸۔ ایضاً ص ۵۳۔۵۴
۳۹۔ حیات مولانا محمد علی جوہر ص
۴۰۔ ایضاً ص ۲۰۵
۴۱۔ معرکہ خلافت وسیاست، ص ۹۰
۴۲۔ ایضاً ص ۹۱
۴۳۔ ایضاً ص ۱۰۷
۴۴۔ ایضاً ص ۱۰۱
۴۵۔ ایضاً ص ۹۲ تا ۹۵
۴۶۔ ایضاً ص ۱۴۴
۴۷۔ حیات مولانا محمد علی جوہر، ص ۲۰۷
۴۸۔ ایضاً ص ۲۰۷
۴۹۔ معرکہ خلافت وسیاست، ص ۱۶۳
۵۰۔ ایضاً ص ۱۶۴۔۱۶۵
۵۱۔ حیات مولانا محمد علی جوہر، ص ۲۰۸۔۲۰۹
۵۲۔ معرکہ خلافت وسیاست، ص ۱۶۹
۵۳۔ ایضاً ص ۱۷۰
۵۴۔ حیات مولانا محمد علی جوہر، ص ۲۱۱
۵۵۔ ایضاً ص ۲۱۱
۵۶۔ معرکہ خلافت وسیاست، ص ۲۱۵
۵۷۔ ایضاً ص ۲۱۵
۵۸۔ ایضاً ص ۲۱۶
۵۹۔ حیات مولانا محمد علی جوہر، ص ۲۱۲
۶۰۔ ایضاً ص ۲۱۳